قرآن وحدیث

آیت "لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِي" کی ایک تاویل

جناب محمد ادریس فلاحی

قرآن پاک میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيمُ رَبِّ
أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتٰى قَالَ
أَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ
لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي قَالَ فَخُذْ
أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْ
هُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ
عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ
جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ
يَأْتِينَكَ سَعْيًا وَاعْلَمْ
أَنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ
حَكِيمٌ ○

(البقرہ: ۲۶۰)

یاد کرو وہ وقت جب ابراہیم نے
خدا سے کہا تھا! اے میرے رب مجھے
بتا دے کہ تو مردہ (دلوں) کو کیسے زندگانی
بخشے گا؟ خدا نے فرمایا کیا تم نے (اس بات
کو) باور نہیں کیا؟ انھوں نے کہا کیوں
نہیں لیکن میں (اپنے مژدۂ امامت دنیا
کی صحت کو) جاننا اس لیے چاہتا ہوں تاکہ
میرے دل کو قرار نصیب ہو، خدا نے فرمایا
چار پرندے لو اور اپنے پاس انھیں مانوس
کرو پھر ان میں سے ہر ایک کو ہر پہاڑ پر رکھ
آؤ پھر تم ان کو بلاؤ تو وہ تمہارے پاس
دوڑتے چلے آئیں گے اور جان رکھو کہ
خدا غالب اور صاحب حکمت ہے۔

اس آیت کریمہ کی عمومی تاویل سے اہل نظر واقف ہیں۔ میں نے اپنے اس مختصر مقالہ میں اس کی عمومی تاویل سے متعلق چند سوالات اٹھائے ہیں اور قرآن وسنت اور لغت عرب کی روشنی میں سلف ہی کی ایک دوسری تاویل کو جسے مفسرین نے عام طور پر نظر انداز کر دیا ہے ترجیح دی ہے جو طالبان قرآن کی خدمت میں غور وخوض کے لیے پیش ہے۔

الفاظ کی تحقیق

لفظ 'اذ' قرآن پاک میں عام طور سے اس وقت استعمال کیا گیا ہے جب کہ کسی اہم واقعہ کی نشاندہی کرنی مقصود ہو یا کسی چیز کا پہلے سے انتظار ہو رہا ہو۔ قرآن میں اس کی متعدد مثالیں بیان ہوئی ہیں بطور نمونہ ایک مثال یہ ہے:۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ	اور یاد کرو وہ وقت جب تیرے
اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ	رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں
خَلِیْفَةً (البقرۃ: ۳۰)	زمین میں اپنا خلیفہ بھیجنے والا ہوں۔

مَوْتیٰ جمع ہے میّت کی۔ قرآن کی رو سے موت دو طرح کی ہوتی ہے۔ طبعی موت اور سیاسی واخلاقی موت، بے ہوشی اور غفلت کو بھی موت کہا گیا ہے[۱]

'اطمینان' علامہ زمخشریؒ نے اس کے معنی ان الفاظ میں بیان کیے ہیں:۔

"ان المراد بالطمانینۃ ھنا	یہاں طمانیت سے مراد وہ علم ہے
العلم الذی لامجال	جس میں شک وشبہ کی بالکل گنجائش
للتشکیک فیہ"[۲]	نہ ہو۔

'فصرھن' "صَوَرٌ" کے معنی میلان اور جھکاؤ کے آتے ہیں 'رَجُلٌ اَصْوَرُ' اس شخص کو کہتے ہیں جس کی گردن جھکی ہوئی یا ٹیڑھی ہو۔ اسی طرح "انی الیکم لاَصُوَر" کے معنی ہیں "میں تمہارا بہت زیادہ مشتاق ہوں"۔[۳]

'جزءاً' "جزء" حصہ کو کہتے ہیں۔ آیت میں عام طور سے مفسرین نے "جزء" سے چڑیوں کا گوشت مراد لیا ہے لیکن یہ بات قابل غور ہے؛ ایک چڑیا کا جزء بولیں گے تو اس کے ہاتھ پیر اور مختلف اجزاء ہوں گے لیکن جب چار چڑیوں کا جزء بولیں گے تو ہر چڑیا

---

[۱] لسان العرب مادہ (موت) جزء ۷ ص ۹۳

[۲] الکشاف جلد اول طبع فی مطبع اللیسی الواقع فی دار الامارۃ کلکتہ ۱۲۷۶ھ ص ۱۷۳

[۳] تفسیر قرطبی ج ۳ ص ۳۰۱۔ واضح رہے کہ تقریباً تمام مفسرین نے 'صَوَرٌ' کے معنی کاٹنا اور ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لیے ہیں۔ جھکاؤ اور میلان کا ذکر کیا بھی ہے تو اسے قیل والی دفعہ میں رکھا ہے۔

ایک جزء ہوگی۔ "جزء من الجماعۃ" کے معنی ہوں گے "جماعت کا ایک فرد کامل۔ قرآن سے اس کی متعدد نظیریں ملتی ہیں۔ "وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادِهِ جُزْءًا" (الزخرف ۱۵) (اور انھوں نے اس کے بندوں میں سے اس کے لیے اولاد مقرر کی) دوسری جگہ ارشاد ہے "لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِنْهُمْ جُزْءٌ مَقْسُومٌ" (الحجر ۴۴) (اس کے سات دروازے ہیں اور ہر دروازے کے لیے ان کا ایک مخصوص حصہ ہوگا) سید محمد رشید رضا نے ابومسلم اصفہانی کا قول نقل کیا کہ:-

انه اضاف الجزء الى الاربعة	چونکہ جزء کی اضافت چار (چڑیوں)
فيجب ان يكون المراد بالجزء	کی طرف ہے اس لیے واجبی طور پر
هو احد من تلك الاربعة[1]	جزء سے ان چار (چڑیوں) میں سے
	صرف ایک چڑیا مراد ہوگی۔

لہٰذا آیت میں ایک کامل چڑیا مراد ہے نہ کہ اس کا جزء۔

مفسرین کی تاویل کا خلاصہ

حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ سے جو سوال کیا تھا (رب ارنی کیف تحی الموتیٰ) مفسرین نے اس کے کئی اسباب بیان کیے ہیں۔ علامہ ابوالفرج بن عبدالرحمٰن الجوزی نے اس کے متعلق سلف سے چار اقوال نقل کیے ہیں۔

① حضرت ابراہیمؑ نے جب مردہ کو دیکھا کہ درندے اسے کھا رہے اور ٹکڑے ٹکڑے کر رہے ہیں تو انھوں نے خدا سے یہ سوال کیا (یہ ابن عباس، حسن بصری، قتادہ، ضحاک، عطا اور ابن جریج کا قول ہے)

② حضرت ابراہیمؑ کو پوری دنیا کی امامت کا جو مژدہ ملا تھا اس سوال کے ذریعہ اس کی صحت معلوم کرنا چاہتے تھے[2]

③ مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی کیفیت کے سلسلے میں ذہن میں جو وسوسہ تھا اس کو زائل کرنا چاہتے تھے (عطا کا ایک قول یہ بھی ہے)۔

---

[1] تفسیر المنار طبع دوم جلد سوم ص ۵۶، اسے امام رازی نے بھی نقل کیا ہے (تفسیر الکبیر جلد ۲ ص ۳۴۵)

[2] یہ سبب اگرچہ صحیح ہے لیکن مفسرین نے اس پر غور و خوض کیے بغیر نظر انداز کر دیا ہے۔

④ نمرود نے احیائے اموات کے متعلق حضرت ابراہیمؑ سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ دکھائیں اللہ کی طرف سے کیا خبر دی گئی ہے۔ (یہ محمد بن اسحاق اور قاضی کا قول ہے)[۱]

ایک اور سبب

مولانا مودودیؒ نے لکھا ہے کہ "انبیاء کو جو خدمت اللہ نے سپرد کی تھی اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے وہ حقیقتیں دیکھ لیتے جن پر ایمان لانے کی دعوت انھیں دنیا کو دینی تھی"[۲] تقریباً یہی خیال مولانا امین احسن اصلاحی کا بھی ہے البتہ فرق یہ ہے کہ مولانا اصلاحی ان کی اپنی قوم پر حجت قائم کرنے کے لیے نہیں بلکہ ذاتی اطمینان قلب کے لیے لیتے ہیں۔[۳]

مفسرین کی تاویل پر چند سوالات

مفسرین کی مذکورہ تاویل پر طالب قرآن کے ذہن میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

پہلا سوال: "کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی" (تو مردہ کو کیسے زندہ کرے گا؟) اس طرح کے سوال کفار و مشرکین کیا کرتے تھے[۴] اگر یہی سوال حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب کیا جائے تو (نعوذ باللہ) ان کی ثقاہت اور نبوت ہی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اس لیے کہ سوال سائل کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ کسی مومن یا نبی کے لیے اس طرح کا سوال کرنا اس کے ایمان و یقین کے منافی ہے۔

دوسرا سوال: اکثر مفسرین لکھتے ہیں کہ اطمینان قلب مشاہدہ عینی کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ حالانکہ قرآنی نظائر اس خیال کے خلاف ہیں۔ قرآن میں ہے "یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً (الفجر ۲۷-۲۸) (اے وہ جس کا دل (ایمان بالغیب پر) جما رہا، چل اپنے رب کی طرف تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی) ایک دوسری جگہ ہے "اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ

---

[۱] ملاحظہ فرمائیں تفسیر زاد المسیر فی علم التفسیر۔ زیر مطالعہ آیت کی تفسیر

[۲] تفہیم القرآن جلد اول ص۲۰۲ [۳] تدبر قرآن جلد اول ص۵۶۳

[۴] ملاحظہ فرمائیں۔ المومنون۔۸۲، النحل ۷۰، صافات ۱۶-۵۳، قٓ ۳، واقعہ ۴۷

اَلْقُلُوْبُ" (الرعد۲۸) (جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور جن کے دل یادِ خدا سے مطمئن ہوتے ہیں اور سن لو کہ یادِ خدا سے دل کو اطمینان نصیب ہوتا ہے) ایک جگہ یوں ارشاد ہوا "مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ" (النحل۱۰۶) (جو شخص ایمان لانے کے بعد خدا کے ساتھ کفر کرے مجبور ہو کر مگر اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہے....)

نفسِ مطمئن وہ ہے جو دنیا میں عُسر و یسر اور نرمی و سختی دونوں طرح کے حالات میں راضی و مطمئن ہوتا ہے اور جس کا ایمان کسی بھی حال میں متزلزل ہونے سے محفوظ رہتا ہے۔

تیسرا سوال: حضرت ابراہیمؑ احیاءِ موتیٰ کی کیفیت معلوم کرنا چاہتے تھے تو پھر اللہ تعالیٰ نے چار چڑیوں کو چار پہاڑوں پر رکھنے کی ہدایت کیوں کی؟ ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے سامنے چار چڑیوں کو کیا صرف ایک چڑیا کو مار کر زندہ کر دیا جاتا تاکہ اس منظر کو دیکھ کر قیامت پر ان کا یقین بڑھ جاتا۔

چوتھا سوال: اگر اس بات کو مان لیا جائے کہ حضرت ابراہیمؑ احیاءِ موتیٰ کے متعلق مشاہدۂ عینی کے خواہشمند تھے (جیسا کہ مفسرین کا خیال ہے) تو پھر اس آیت میں امت مسلمہ کے لیے کیا پیغام ہے؟ کیا اہلِ ایمان کو ان کے مشاہدۂ عینی کے ذریعہ یہ پیغامِ تسلی ہے کہ دین کی دعوت انھیں بھی دنیا کو دینی ہے اس لیے وہ بھی احیاءِ موتیٰ کے متعلق اطمینانِ قلب کی خاطر، مشاہدۂ عینی کا مطالبہ کریں۔ تب جا کر لوگ اس دین کو اختیار کریں گے؟

یہ وہ سوالات ہیں جو طالبِ قرآن کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں اور جن کا جواب اسے تفسیر کی کتابوں میں نہیں ملتا ہے۔

اس آیت کا مخاطب کون ہے؟

اس آیت پر غور کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کے مخاطب کو متعین کر لیا جائے تاکہ صحیح تاویل، صحیح نظم اور موقع محل کے محاسن کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ (اذ قال ابراھیم) یاد کرو وہ وقت جب ابراہیم نے کہا تھا" اس طرح کا اسلوب قرآن مجید میں جہاں بھی آیا ہے۔ وہاں خاص طور سے اس کے مخاطب آپؐ اور آپؐ کے توسط سے سارے اہلِ ایمان ہوتے ہیں۔ علامہ خازنؒ نے اس کی توضیح اس طرح کی ہے واذ قال ابراھیم ای واذکر یا محمد اذ قال ابراھیم[1]، علامہ بقاعی نے اس کو مزید اور واضح کر دیا فرماتے ہیں۔

[1] تفسیر الخازن جلد اول ص۲۳۷

"واذ" واذکروا قصة ابیکم ابراھیمؑ[1] جس کا مقصد کسی اہم واقعہ کی یاد دہانی ہوتی ہے تاکہ دعوتِ دین کی راہ میں پیش آمدہ سخت حالات سے نمٹا جاسکے۔ کفار و مشرکین، اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) اور منافقین نے انبیائی مشن کو زک پہنچانے میں جو کلیدی رول ادا کیا تھا، یہ آپؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کے لیے سخت پریشان کن مسئلہ بنا ہوا تھا۔ ایسے حالات میں حضرت ابراہیمؑ کی دعوت اور ان کی زندگی کے ہر پہلو سے نبیؐ کو جو سبق حاصل ہوسکتے تھے وہ کسی اور طریقے سے حاصل نہیں ہوسکتے تھے اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ اسی ملت بیضا کی تجدید و تکمیل کے لیے آئے تھے جس کی دعوت ابراہیمؑ نے دی تھی اور اسی قوم کے اندر آئے تھے جو حضرت ابراہیمؑ کی نام لیوا تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی کہ ابراہیمؑ کی داعیانہ زندگی کو اپنے لیے نمونہ بناؤ جو کبھی بھی حالات کی سنگینی سے مایوس نہیں ہوئے بلکہ جہد مسلسل کو ہمیشہ اپنا نصب العین بنائے رکھا۔

مفسرین کی مشترک تاویل کا جائزہ

مفسرین نے حضرت ابراہیمؑ کے سوال کی متعدد تاویلیں کی ہیں لیکن ان تاویلوں میں سے جس کو تقریباً تمام ہی مفسرین نے ترجیح دینے کی کوشش کی ہے یہ ہے کہ جب نمرود نے اپنی خدائی کا دعویٰ کیا تو اس کے جواب میں حضرت ابراہیم نے رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ (میرا رب وہ ہے جو مارتا اور جلاتا ہے) فرمایا۔ چونکہ انھیں اپنے مخاطبین کو دعوت دینی تھی اس لیے انھوں نے اپنے اس (ربی الذی یحیی ویمیت) جواب کو علم یقین کی بنیاد پر قائم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی (رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی) مفسرین نے اس بات کو مدلل کرنے کے لیے یہ حدیث پیش کی ہے۔

عن ابی ھریرۃؓ قال: قال	حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے
رسول اللہؐ نحن احق بالشك	فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ارشاد
من ابراھیم اذ قال رَبِّ اَرِنِیْ	فرمایا ہم ابراہیم سے زیادہ شک کرنے
تُحْیِ الْمَوْتٰی قال اولم	کے حق دار ہیں جب کہ انھوں نے خدا

---

[1] نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور جلد ۴ طبع اول ص ۶۱

تُؤمِنْ قَالَ بَلٰی وَلٰکِنْ لِیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ [1]	سے کہا اے میرے رب مجھے بتا دے کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا خدا نے فرمایا کیا تم اس بات کو باور نہیں کرتے ؟ تو انھوں نے کہا کیوں نہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرا دل مطمئن ہو جائے ۔

اس کا جواب خود قرآن سے ملتا ہے انبیا سمیت پوری انسانیت سے قرآن کا پہلا مطالبہ ایمان بالغیب کا ہے ۔ "اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ" (البقرہ ۳) (جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں)

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہر نبی کے لیے غیب کی حقیقتوں پر ایمان لانا اور انسانوں کو اس پر ایمان لانے کی دعوت دینا شرط اولین ہے ۔ اسی ان دیکھی حقیقتوں پر ایمان یا عدم ایمان کے امتحان کے لیے انسانی دنیا بسائی گئی اور انبیاء کا ایک طویل سلسلہ قائم کیا گیا تھا ۔ حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے جس اعلیٰ مقام پر فائز کیا تھا قرآن حکیم نے اس کی جامع تعبیر لفظ "حنیف" سے کی ہے جو ایمان بالغیب اور ان دیکھی قوت پر یقین کامل ، عزم و حوصلہ کی پختگی ، راہ حق میں پہاڑ کی سی ثابت قدمی ، نصب العین سے غیر متزلزل وابستگی اور راہ خدا میں آنے والی آزمائشوں کو برضا و رغبت انگیز کر لینے کی غیر معمولی صلاحیت سے عبارت ہے جس کا تقاضا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے کوئی ایسا مطالبہ نہ کریں ، جس کی وجہ سے ان کا ان دیکھی حقیقتوں پر ایمان و یقین بلکہ نبوت ہی خطرے میں پڑ جائے ۔

جہاں تک قول رسولؐ "نحن احق بالشك من ابراهيم" کے مفہوم کا تعلق ہے تو جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے اس میں یہ نہیں کہا گیا کہ حضرت ابراہیمؑ یا رسول اللہؐ کو شک تھا بلکہ دونوں سے شک کی نفی کی گئی ہے ۔ چنانچہ علامہ ابو الفضل شہاب الدین آلوسی لکھتے ہیں :-

قطع النبیؐ دابر هذا الوهم بقوله "نحن احق بالشك من ابراهيم" ای ونحن	نبیؐ نے اس وہم (شک) کی جڑ کاٹ دی اپنے اس قول کے ذریعہ کہ "اگر خدا کے بارے میں احیاء موتی کے متعلق شک

---

[1] بخاری ج ۲ کتاب التفسیر باب اذ قال ابراہیم رب ارنی ص ۶۵۰ ۔ مسلم ج ۱ کتاب الایمان باب زیادۃ طمانینۃ القلب بتظاہر الادلۃ ص ۸۵ نیز ملاحظہ ہوں ، مختصر تفسیر ابن کثیر ، تفسیر خازن ، تفسیر الکبیر اور تفسیر طبری ، زیر مطالعہ آیت کی تفسیر

لم نشك فلان لا يشك ابراهيم احرى، وقيل ان الكلام مع افعل جاء هنا لنفي المعنى عن الحبيب والخليل عليهما السلام اى لا شك عندنا جميعاً[1]

و شبہ کی گنجائش ہوتی تو اس معاملہ میں ہم ابراہیم سے زیادہ حق دار تھے یعنی ہم شک نہیں کیا کرتے اس لیے کہ حضرت ابراہیم قطعاً شکی نہیں تھے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں اَفعَل (اسم تفضیل) کے ساتھ جو کلام وارد ہوا ہے حبیبؐ خدا اور خلیل اللہؑ دونوں کی جانب سے شک کی کلی نفی کے لیے ہے۔ اس لیے ہمارے نزدیک کسی کے بارے میں بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

اسی طرح ابوسلیمان الخطابی ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"ليس فى قوله" نحن احق بالشك من ابراهيم اعتراف بالشك على نفسه ولا على ابراهيم لكن فيه نفى الشك عنهما يقول اذا لم اشك انا فى قدرة الله على احياء الموتى فابراهيم اولى بان لا يشك[2]

قول رسولؐ (اگر قدرۃ اللہ علیٰ احیاءِ موتیٰ کے متعلق" شک و شبہ کی گنجائش ہوتی تو ہم ابراہیمؑ سے زیادہ حقدار تھے) میں اپنے اور نہ ابراہیمؑ کے بارے میں شک کا اعتراف ہے بلکہ اس میں دونوں سے شک کی نفی ہے۔ اس طور سے کہ جب میں اللہ کی قدرت علیٰ احیاءِ موتیٰ کے بارے میں قطعاً شکی نہیں ہوں تو ابراہیم بدرجۂ اولیٰ شکی نہیں ہو سکتے۔

اس میں شک نہیں اس حدیث سے بعض مفسرین نے شک کا مفہوم لیا ہے حافظ

---

[1] روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی / لابی الفضل شہاب الدین آلوسی جلد اول ص۲۸

[2] تفسیر الخازن جلد اول ص۲۳۶ / ابن ابی حاتم سے بھی یہی مروی ہے۔ بحوالہ ابن کثیر جلد اول۔

ابن کثیر نے اس کی صراحت اس طرح کی ہے۔ وقیل لما نزلت ھٰذہ الآیۃ قال قوم شك ابراھیم" ابن کثیر جلد اول ص۳۱۵ / وقال اٰخرون قال ذالك لربه لانه شك فی قدرۃ اللہ علیٰ احیاء الموتیٰ (ابن جریر طبری جلد۳ ص۳۱) ایسے مفسرین کی تعداد زیادہ ہے جنھوں نے اس کی نفی کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کی صحیح تاویل ہمیں نہیں ملتی۔ وہ جو تاویل کرتے ہیں وہ یہ ہے :-

ان المسئلۃ من ابراھیم	ابراہیمؑ کا سوال شک کی جہت سے نہیں
علیہ لم تعرض من جہۃ	بلکہ مشاہدۂ عینی کے ذریعہ علم میں اضافہ
الشك ولکن من قبل زیادۃ	کے قبیل سے پیش آیا تھا کیونکہ عینی مشاہدہ
العلم العیان فان العیان	کا فائدہ معرفت اور اطمینان (قلب) کا
یفید من المعرفۃ والطمانینۃ	حصول ہے جس سے استدلال کا فائدہ
مالا یفیدہ الاستدلال [1]	مطلوب نہیں ہے۔

حالانکہ یہ تاویل اس وجہ سے قابل غور ہے کہ نبی پوری معرفت اور مکمل اطمینان سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اس کی معرفت اور اطمینان قلب کو متزلزل نہیں کر سکتی اور نہ نبی اس کی خاطر خدا سے کوئی ایسا مطالبہ کر سکتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے۔[2] چنانچہ ارشاد باری تعؑ ہے :-

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ	اور اللہ تم کو غیب کی باتوں سے مطلع
(آل عمران ۱۷۹)	نہیں کر سکتا۔

---

[1] ایضاً ص۲۳۷

[2] جب حضرت موسیٰؑ نے خدا سے رویت باری تعؑ کا مطالبہ کیا تو خدا نے صاف فرما دیا "لَنْ تَرَانِیْ" تم مجھ کو ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔ چونکہ حضرت موسیٰ کا یہ مطالبہ مناسب نہ تھا اس لیے اللہ نے ان کو اپنی معمولی تجلی کے ذریعہ ایسا جھٹکا لگایا کہ وہ بے ہوش ہو گئے اور جب افاقہ ہوا تو ان الفاظ میں توبہ کی "سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ" (اعراف ۱۴۳) تیری ذات ہر طرح کی غلطیوں سے پاک ہے اور میں تیرے حضور میں توبہ کرتا ہوں اور غیب پر ایمان لانے والوں میں سب سے اول ہوں۔" مجاہد ابن عباس، حسن، ابن جریر اور ابو العالیہ کا خیال ہے کہ "انا اول المومنین" ای انا اول من آمن بك انه لا یراك احد من خلقك الی یوم القیامۃ "یعنی تجھ پر (غیب میں رہ کر) ایمان لانے والوں میں اول ہوں کہ تجھ کو قیامت تک تیری خلق میں سے کوئی دیکھ نہیں سکتا" مختصر تفسیر ابن کثیر ج۲ ص۴۹

حضرت علیؓ کے ایمان ویقین کے متعلق علامہ ابوالفضل شہاب الدین آلوسی رقمطراز ہیں:۔

تعلم ان علیا لم یثبت	اس بات کو یاد رکھو کہ حضرت علیؓ کے ایمان
لنفسہ مرتبۃ فی الایمان	کا جو مرتبہ ہے بذات خود خلیل اللہ (ابراہیم)
اعلی من مرتبۃ الخلیلؑ	کے ایمان کے مقابلہ میں اعلیٰ نہیں ہو سکتا
فیہ یقولہ "لو کشفت	ان کے اس قول کی وجہ سے کہ اگر پردۂ
لی الغطاء ما ازددت یقیناً"[1]	غیب کو میرے سامنے سے ہٹا دیا جائے
	تو پھر بھی میرے ایمان ویقین میں کوئی
	اضافہ نہ ہوگا۔

جب حضرت علیؓ کا ایمان اس پائے کا ہے کہ اگر ان کے سامنے سے پردۂ غیب کے ہٹنے سے ان کے ایمان میں کوئی اضافہ نہ ہوگا تو بہر حال حضرت ابراہیمؑ وقت کے نبی ہی نہیں بلکہ جنھیں خدا نے خلیل اللہ کے لقب سے نوازا ہو تو ان کے ایمان ویقین کی کیا شان اور مرتبہ ہوگا اس کا اندازہ اہلِ علم ہی بخوبی لگا سکتے ہیں۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ "انبیاء کو جو خدمت اللہ نے سپرد کی تھی اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے وہ حقیقت دیکھ لیتے جن پر ایمان لانے کی دعوت انھیں دنیا کو دینی تھی" حقیقت یہ ہے کہ اس مفہوم کو اختیار کرنے میں قرآنی شواہد ونظائر ساتھ نہیں دیتے اور نہ آیت میں اس کی گنجائش ہی ہے۔ اگر یہی مفہوم مراد ہوتا تو حضرت ابراہیمؑ "ولکن لیطمئن قلبی" کے بعد "وبہ ادعو الناس الی الاسلام" (اور اس کے ذریعہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دے سکوں) کے مفہوم کی کوئی عبارت بھی شامل کرتے یا اللہ تعالیٰ شامل کرواتا اور چار چڑیوں کو اپنے پاس مانوس کرنے اور چار پہاڑ پر رکھنے کی ہدایت نہ کی جاتی بلکہ ایک ہی چڑیا ان کے سامنے مار کر زندہ کر کے تماشہ دیکھنے کے لیے کافی تھی۔

حضرت ابراہیمؑ کی درخواست کی حقیقت

"واذ قال ابراھیم رب ارنی کیف تحیی الموتی" اور یاد کرو وہ وقت جب ابراہیمؑ

---

[1] روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی / لابی الفضل شہاب الدین آلوسی، جلد اول ص۲۷

نے خدا سے کہا تھا۔ اے میرے رب تو مردہ دلوں کو کیسے زندگانی بخشے گا؟ آیت میں لفظ "موتیٰ" کے عموم کی رعایت سے مفسرین نے ان تمام اسباب کو اس کے دائرہ میں داخل کر دیا جو اس میں داخل ہو سکتے تھے تاکہ لفظ عام، وسیع اور اپنی دلالت میں اسم بامسمیٰ (موتیٰ) ہو۔ اگر اس آیت کی کوئی ایسی تاویل کی جائے جس سے حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت اور ان کی نبوت کی امتیازی حیثیت واضح ہو کر سامنے آجائے تو نہ صرف آیت کی وسعتِ معانی سے یہ بات ہم آہنگ ہوگی بلکہ قرآنی تعلیمات کے ایک لامتناہی سلسلہ کا سراغ ملے گا۔

سوال یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی اس دعوت کے پس پردہ کیا روح کارفرما تھی؟ اس کا پس منظر کیا تھا۔ ان کو کن حالات سے سابقہ پیش آیا تھا؟ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی تاریخ اپنی منفرد شان رکھتی ہے۔ زندگی کے آخری لمحات تک وہ جن سخت حالات سے گزرے ہیں، انبیاء کی تاریخ میں سب سے زیادہ حیرت انگیز ہیں، دورِ آتش نمرودی، دورِ ترکِ وطن (ہجرت) دورِ قربانی اسماعیلؑ اور دورِ تعمیر خانۂ خدا، یہ وہ ادوار ہیں جن کی پشت پر یہ سنہرے حروف لکھے جا چکے ہیں کہ "حضرت ابراہیمؑ کی پچھتر سالہ دعوت و تبلیغ کے نتیجہ میں حضرت لوطؑ[1] کے سوا، ان کی پوری تاریخ میں کوئی ایسا گروہ بھی نہ ہوا جس میں قبولیت حق کی استعداد دکھائی دیتی ہو۔ ایک طرف دعوتِ حق کے نتائج سے بے چینی کہ پوری قوم روحانی و اخلاقی اعتبار سے مردہ ہو چکی ہو، اس کے اندر خیر کو اختیار کرنے کی کچھ بھی صلاحیت باقی نہ رہی ہو اور دعوت بھی دینے میں کوئی کسر نہ رہ گئی ہو، ادھر خانہ کعبہ کی تعمیر کرائی جا چکی ہو اور پوری دنیا کی امامت کا مژدہ بھی سنایا جا چکا ہو" قال انی جاعلك للناس اماما" (البقرہ ۱۲۴) (خدا نے کہا کہ میں تم کو لوگوں کا پیشوا بناؤں گا) اور پھر خدا کا یہ حکم" وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ" (البقرہ ۱۲۵) (اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل سے کہا کہ طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے میرے گھر کو پاک و صاف رکھا کرو) تو ایسی صورت میں حضرت ابراہیمؑ کی خوشی اور تعجب کی جو کیفیت تھی، اس کا بے انتہا

---

[1] صرف حضرت لوطؑ کے ایمان لانے کا ذکر" فامن لہ لوط وقال انی مہاجر الی ربی" (العنکبوت ۲۶) (تو ابراہیمؑ کی دعوت صرف لوطؑ نے قبول کی اور ابراہیمؑ کہنے لگے کہ میں اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کر رہا ہوں)

ہونا فطری ہے۔ اسی جذبہ سے سرشار ہوکر حیرت و استعجاب کے عالم میں خدا سے کہہ رہے ہیں۔ الٰہی! جن لوگوں کو میں نے اسلام کی دعوت دینے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی آخر لوگ وہی تو ہیں جن کے قلوب و اذہان، انکار دعوت کی وجہ سے مردہ ہو چکے ہیں۔ خدایا کس طرح تو انھیں زندگانی بخشے گا کہ خانۂ خدا کے مقصد کو پورا کریں گے اور میری امامت میں دوش بدوش اس کارِ عظیم کو سنبھالیں گے؟[1]

اطمینان قلب، جذبۂ تشکر کی تعبیر ہے

حضرت ابراہیمؑ کے معصومانہ سوال پر جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اَوَلَمْ تُؤْمِنْ" (کیا تم کو اس بات پر یقین نہیں؟) تو انھوں نے کہا "بلیٰ ولکن لیطمئن قلبی" "کیوں نہیں؟ لیکن میں (اپنے مژدۂ امامت کو) اس لیے جاننا چاہتا ہوں تاکہ میرے دل کو قرار نصیب ہو۔ حضرت ابراہیمؑ کا یہ وہی جذبۂ تشکر تھا جو حضرت زکریاؑ نے بیٹے کی بشارت سن کر کہا تھا۔

رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ	اے میرے پروردگار میرے ہاں لڑکا
وَّقَدْ بَلَغَنِیَ الْکِبَرُ وَامْرَاَتِیْ	کیونکر پیدا ہوگا کہ میں تو بڈھا ہو گیا ہوں
عَاقِرٌ ط (آل عمران ۴۰)	اور میری بیوی بانجھ ہے۔

حضرت زکریاؑ کی یہ درخواست، شک یا انکار کے قبیل سے نہیں بلکہ بہت ہی حسین و بلیغ انداز سے اظہارِ تشکر ہے۔ حدیث میں بھی اس طرح کی مثال ملتی ہے حضرت انسؓ سے مروی ہے رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تم میں سے اپنے اس بندے سے بہت زیادہ خوش ہوتا ہے جو اللہ کی طرف پلٹتا ہے، اس کی مثال اس سوار کی ہے جو اپنے اونٹ پر بے آب و گیاہ میدان میں سفر کر رہا تھا کہ اچانک زادِ راہ سے لدا ہوا اونٹ کھو گیا۔

---

[1] قرآن کے اعجاز بیان کا امتیازی وصف ہے کہ بہت ساری باتوں کو حذف کرکے ایک ایسا لفظ یا جملہ رکھ دیتا ہے کہ اسکی وسعتِ معانی کے سارے اطراف معہود بالذہن ہوتے ہیں اور جن کی تفصیل بالعموم مختلف مقامات پر مختلف اسلوبوں میں بیان کردی جاتی ہے۔ قرآن خود کہتا ہے "کتٰبٌ احکمت اٰیاتہ ثم فصلت من لدن حکیم خبیر" (ہود ۱) (یہ وہ کتاب ہے جسکی آیات پہلے مستحکم کی گئی ہیں اور پھر خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے یہ تفصیل بیان کردی گئی ہے) اس لیے حضرت ابراہیمؑ کی درخواست کا اسلوب ان کی زندگی کے بیش بہا کارناموں کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔

کافی تلاش و جستجو کی۔ نہ ملنے پر مایوس ہو کر ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا، دریں اثنا اس نے دیکھا کہ اس کا اونٹ اس کے پاس کھڑا ہے۔ اس نے اس کی نکیل پکڑی اور خوشی سے تاب نہ لاکر پکار اٹھا۔ خدایا آج کا معاملہ ایسا ہے کہ تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب[1]۔

حقیقت یہ ہے کہ جب کسی کو کوئی غیر معمولی چیز یا بشارت ملتی ہے تو اس وقت اس طرح کے الفاظ اپنے آپ زبان پہ آجاتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کی یہ درخواست برائے واقفیت نہیں تھی بلکہ اس وقت کے حالات کے اعتبار سے اپنے آپ دل میں پھوٹ پڑی تھی جیسے یقین نہ آرہا ہو کہ ان الفاظ سے تعبیر کی کوشش کی جائے۔

لفظ "موتیٰ" روحانی موت کی تعبیر ہے

"کیف تحیی الموتیٰ" (تو مردہ دلوں کو کیسے زندہ کرے گا؟) چونکہ قرآن مجید میں ان لوگوں کے لیے جنہوں نے دعوتِ حق سے مسلسل اعراض کی روش اختیار کر رکھی ہے بلکہ اس کی راہ میں مزاحم بنتے رہتے ہیں اور آخر وقت تک ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے ہیں ان کے لیے "موتیٰ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس لیے کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ہم نے اس کے معنیٰ بدل دیئے ہیں بلکہ خود قرآن حکیم میں ایسے موقع پر جن معنوں میں استعمال ہوا ہے ان ہی معنوں کو اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۠ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝ (البقرہ: ۲۴۳)	تم نے ان لوگوں کے حال پر بھی کچھ غور کیا، جو موت کے ڈر سے اپنے گھر بار چھوڑ کر نکلے تھے اور ہزاروں کی تعداد میں تھے، اللہ نے ان سے فرمایا: مر جاؤ۔ پھر اس نے ان کو دوبارہ زندگی بخشی، حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان پر بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔

یہاں "موتوا" سے خوف و بزدلی کی موت اور "احیاہم" سے روحانی و اخلاقی زندگی مراد ہے۔ چنانچہ

---

[1] مسلم، کتاب التوبہ ج دوم ص۳۵۵

مولانا مودودیؒ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں :۔

"یہ اشارہ بنی اسرائیل کے واقعۂ خروج کی طرف ہے ..... یہ لوگ بہت بڑی تعداد میں مصر سے نکلے تھے، دشت و بیاباں میں بے خانماں پھر رہے تھے ..... مگر جب اللہ کے ایماء سے حضرت موسیٰؑ نے ان کو حکم دیا کہ ظالم کنعانیوں کو ارضِ فلسطین سے نکال دو اور اس علاقہ کو فتح کر لو، تو انھوں نے بزدلی دکھائی اور آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ آخر کار اللہ نے انھیں چالیس سال تک زمین میں سرگرداں پھرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ ان کی ایک نسل ختم ہو گئی اور دوسری نسل صحراؤں کی گود میں پل کر اٹھی۔ تب اللہ نے انھیں کنعانیوں پر غلبہ عطا کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی معاملہ کو موت اور دوبارہ زندگی کے الفاظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔"[۱]

مولانا امین احسن اصلاحی نے پُرزور انداز میں اس کی تائید کی ہے۔ لکھتے ہیں "جب انھوں نے خوف اور بزدلی کی زندگی اختیار کی تو اللہ نے ان کو اس ایمانی و اخلاقی موت کے حوالہ کر دیا جس کی تعبیر "موتوا" سے فرمائی ہے ..... پھر جب ان کے اندر تجدید و احیائے ملت کی دعوت اٹھی اور انھوں نے از سرِ نو ایمان و اسلام کی حیات تازہ اختیار کر لینے کا عزم کر لیا تو اللہ نے ان کو از سرِ نو زندہ و متحرک کر دیا، اسی چیز کو یہاں "ثم احیاہم" کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔"[۲]

ایک جگہ لفظ "موتیٰ" کی صراحت کے ساتھ ارشاد ہے :

فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ	تو تم مردہ دلوں کو بات نہیں سنا سکتے
الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا	اور نہ بہروں کو جبکہ وہ پیٹھ پھیر کر پھر جائیں
مُدْبِرِيْنَ ○ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ	آواز سنا سکتے ہو اور نہ اندھوں کو ان کی
الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ (الروم ۵۳-۵۲)	گمراہی سے (نکال) کر راہِ راست پر لا سکتے ہو۔

ایک جگہ یوں ارشاد ہے :

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَ	کیا وہ شخص جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اسے
جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي	زندگی بخشی اور اس کو وہ روشنی عطا کی

۱؎ تفہیم القرآن جلد اوّل طبع ۱۸ صـ۱۸۲

۲؎ تدبر قرآن جلد اوّل طبع سوم صـ۵۲۱

النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهُ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ط (الانعام ۱۲۲)	جس کے اجالے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہو اور کسی طرح ان سے نہ نکلتا ہو۔

مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں "یہاں موت سے مراد جہالت و بے ہوشی کی حالت ہے اور زندگی سے مراد علمی ادراک اور حقیقت شناسی کی حالت"[۱]

دوسری جگہ یوں ارشاد ہے:

"افانت تسمع الصم او تهدی العمی ومن کان فی ضلال مبین (الزخرف: ۴۰)	تو کیا تم بہرہ کو سنا سکتے ہو یا اندھے کو راستہ دکھا سکتے ہو اور جو صریح گمراہی میں ہو اسے راہ راست پر لا سکتے ہو۔

یہاں مردوں، بہروں اور اندھوں سے وہ لوگ مراد ہیں جن کا اندرون مردہ ہو چکا ہو اور جن کے اندر اخلاقی زندگی کی رمق بھی باقی نہیں رہی ہو، جن کی بندگی نفس، ضد اور ہٹ دھرمی نے ان کے اندر کی اس صلاحیت کا خاتمہ کر دیا ہے جو آدمی کو حق بات سمجھنے اور قبول کرنے کے لائق بناتی ہے۔ انہی صفات سے متصف لوگوں کو دیکھ کر حضرت ابراہیمؑ نے خدا سے ان کی روحانی زندگی سے متعلق درخواست کی تھی کہ اس کی شکل کیا ہوگی؟ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے پرندوں کی مثال سے جس حیرت انگیز حقیقت کی نشاندہی فرمائی ہے۔ اس مثال کا ایک ایک لفظ گواہی دیتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا[۲] کی قبولیت اور اس کے ظاہر ہونے کا وقت آ گیا ہے۔

۱؎ تفہیم القرآن۔ جلد اول ص۵۷۸

۲؎ یہ دعا حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے اس وقت کی تھی جب کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔ "ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم ربنا واجعلنا مسلمين لك ومن ذريتنا امة مسلمة لك" (البقرہ: ۱۲۸ - ۱۲۷) اے ہمارے رب اس کو ہماری طرف سے قبول فرما لیجئے، بے شک آپ ہی سننے اور جاننے والے ہیں۔ اے ہمارے رب ہمیں فرماں بردار بنا لیجئے اور ہماری اولاد میں سے بھی اپنی فرماں بردار امت بنائیے۔

پرندوں کی مثال سے انقلاب انگیز حقیقت کی نشاندہی

حضرت ابراہیمؑ کو جیسا کہ یہ بات گزر چکی ہے کہ اگر مُردوں کو زندہ کرنے کی خواہش ہوتی اور پرندوں کو ٹکڑے کرنے والی بات ہوتی تو اس کے لیے عبارت یوں ہوتی "فَخُذْ اربعۃً من الطیر فقطعھن واجعل علی کل جبل منھن جزءًا" اس لیے کہ بقول علامہ ابن جریر طبریؒ۔ یہ اس کے غیر معروف معنی ہیں[1]۔

اگر اسے تسلیم بھی کریں تو چار پرندوں کو اپنے پاس مانوس کرنے اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے چار پہاڑ پر رکھنے کی کیا ضرورت تھی بلکہ ایک ہی پرندہ کو وہیں ان کے سامنے ذبح کر کے زندہ ہونے کا منظر دیکھنے کے لیے کافی تھا۔ مزید یہ کہ چار پہاڑوں اور لفظ "سعیًا"[2] کا ذکر کیوں کیا گیا؟ جب کہ زندگی سے احیاءِ موتیٰ اور "یاتینک" سے پرندوں کی آمد کا ثبوت ہو گیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں جو واقعہ ہے اس کا رخ کسی انقلاب انگیز حقیقت کی طرف ہے، حضرت ابراہیمؑ کو اپنی قوم کی بے راہ روی دیکھ کر سب سے بڑی فکر یہی تھی کہ "میری امامت اور خانۂ کعبہ کی تعمیر کا مقصد کیسے پورا ہوگا؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے دعوت حق کی انقلاب انگیز حقیقت چڑیوں کی مثال سے واضح کر دی کہ اگر تم ایک چڑے کو مدت تک اپنے ساتھ رکھ کر اتنا تربیت یافتہ بنا سکتے ہو کہ وہ تمہاری آواز سنتی اور بلانے پر اڑتی ہوئی آ سکتی ہے تو کیا گمراہ انسان دعوت حق کی تعلیم و تربیت سے اس درجہ متاثر نہیں ہو سکتے کہ وہ تمہاری ان کوششوں کی قدر کریں اور مرکزِ توحید کے مقصد کو پورا کریں۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا، اس مردِ خدا کی دعوت حق نے انسان اور گمراہ روحوں کی جو تربیت کی تھی اس نے انسانی تاریخ کا عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ قوموں کی قومیں اور نسلوں کی نسلیں دعوت ابراہیمی پر قدم اٹھاتی اور اگرچہ تقریباً تین ہزار برس سے زیادہ مدت بیت چکی ہے، لیکن آج بھی ہر سال (موسم حج میں) انسانوں کے بے شمار غول ابراہیمؑ کی صدا میں صدا

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری ج ۳۔ صفحہ ۳۴ ان قول القائلین صارھن او صارھن غیر معروف فی کلام العرب بمعنی قطع

[2] لایقال للطائر اذا طار سعی (تفسیر خازن جزء اول ص ۲۳۵، نیز ملاحظہ فرمائیں تفسیر کبیر جلد ۲ ص ۳۲۶)

ملاتے ہوئے سعی کرتے اور مصلائے ابراہیمی میں جمع ہوتے ہیں۔

چار پرندے چار پہاڑوں پر، گویا چہار جانب سے حجاج کے لشکر کے دوڑتے ہوئے آنے کی ایک جامع تعبیر قرآن مجید نے "سعیًا" کے لفظ سے کی ہے۔ یعنی ایک قوم جو اعتقادی حیثیت سے مردہ ہو چکی ہے وہ دور دراز سے "لبیک اللھم لبیک لا شریک لک لبیک" زبان سے جاری، سعی کرتے ہوئے آئے گی۔[1] قرآن میں اس کی تصویر کشی یوں کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا:۔

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْکَ	اور لوگوں میں حج کے لیے ندا کر دو وہ تمہاری
رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ	طرف آئیں گے پیادہ بھی اور اونٹوں پر بھی
کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ○ (الحج ۲۷)	جو دور دراز راستوں سے چلے آئیں گے۔

چنانچہ اس کی عملی شکل ہم حج کے موقع سے دیکھ سکتے ہیں کہ ہزاروں عاشقانِ خدا ہر چہار جانب سے مرکز توحید کی طرف خدا سے عشق و جنون کا سہارا لئے چلے جا رہے ہیں۔ جیسے کوئی اسلامی لشکر ہو جو میدان جنگ کی طرف چلا جا رہا ہو۔

قدرتِ خداوندی

واعلموان اللہ عزیز	"اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ بڑا زبردست
حکیم	اور صاحب حکمت ہے"

مطلب یہ ہے کہ (ابراہیم!) تم سے اتنا بڑا (خانۂ کعبہ کی تعمیر کا) کام جو کرایا گیا ہے، اس کے پیچھے خدا کی حکمت و مصلحت یہی تھی کہ قیامت تک کے لیے اس کو مرکز قبلۂ مستقل کی حیثیت حاصل رہے اور جس مسلم حنیف کا تم نے حق ادا کیا ہے یہ نسل انسانی کے لیے اسوۂ حسنہ رہے۔ "عزیز و حکیم" یعنی ظاہری و باطنی جتنی بھی خوبیاں ہو سکتی ہیں۔ سب کا وہ جامع ہے۔

آیت کا ماقبل سے تعلق

۱۔ الم تر الی الذی حاج ابراھیم	بھلا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو اس

[1] ترجمان القرآن - زیر مطالعہ آیت کی تفسیر

فی ربّہ ان اتاہ اللّٰہ الملک (البقرہ ۲۵۸)	غرور کے سبب سے کہ خدا نے اس کو سلطنت بخشی تھی۔ ابراہیم سے خدا کے بارے میں جھگڑنے لگا۔
۲۔ اوکالّذی مرّ علیٰ قریۃ وھی خاویۃ علیٰ عروشھا قال انّیٰ یحیی ھذہ اللّٰہ بعد موتھا (البقرہ ۲۵۹)	یا اسی طرح اس شخص کو نہیں دیکھا جسے ایک گاؤں میں جو اپنی چھتوں پر گرا پڑا تھا وہاں سے گزر ہوا تو اس نے کہا کہ خدا اس (کے باشندوں) کو روحانی موت کے بعد کیونکر زندہ کرے گا؟
۳۔ واذ قال ابراھیم ربّ ارنی کیف تحیی الموتیٰ (البقرہ: ۲۶۰)	یاد کرو وہ وقت جب ابراہیم نے خدا سے کہا تھا کہ اے میرے رب تو مُردہ دلوں کو کس طرح زندگی بخشے گا؟

یہ تینوں واقعات احیاء بعد الممات اور قدرت خداوندی کی تمام ترکیفیات کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس سے قبل آیت الکرسی میں "حیّ وقیوم" کی بات تھی یعنی اللہ حی ہے اور زندہ قوم کو پسند فرماتا ہے۔ اس سے پہلے بھی طالوت کی قوم کے بارے میں اللہ کا فرمان بھی احیاء بعد ممات کا ہے "فقال لہم موتوا ثم احیاھم" (البقرہ ۲۴۳) (خدا نے ان کو حکم دیا مرجاؤ پھر ان کو زندہ بھی کر دیا) گویا جس نے اللہ سے رشتہ کو مستحکم کیا اس کو ہی دنیا میں زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ جس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے جتنا مستحکم ہوگا اس کو اتنی ہی بہترین زندگی حاصل ہوگی اور پھر دعوت دین کی راہ میں ناسازگاری حالات کی پروا کیے بغیر منزل مقصود کی طرف رواں دواں رہے گا۔

آیت میں امت مسلمہ کے لیے پیغام

قرآن مجید اور انسانی تاریخ بتاتی ہے کہ دنیا میں جب کبھی انبیاء اور صلحا، آئے، ان کو اور اہلِ ایمان کو خدا کے باغی اور سرکش بندوں سے سخت مقابلہ پیش آیا اور انھوں نے اپنی جانوں اور اپنے

لہ علامہ ابو سعودؒ نے حضرت مجاہدؒ کا قول نقل کیا ہے کہ گزرنے والا کوئی کافر تھا "کان المارّ رجلاً کافراً بالبعث" (تفسیر کبیر جلد دوم طبع اول ص ۲۲۱)

مالوں کو جوکھوں میں ڈال کر باطل کے طریقوں کے مقابلہ میں اقامت دین کے لیے پیہم جد وجہد کی۔ اس دین کا راستہ کبھی بھی پھولوں کا سیج نہیں رہا کہ "آمنّا" ہم ایمان لے آئے۔ "اسلمنا" ہم نے اپنے وجود کو سپرد کر دیا۔ "صدقنا" ہم نے اس کو حق تسلیم کیا، کہا اور لیٹ گئے بلکہ اس قول و قرار کا فطری تقاضا ہر زمانے میں یہ رہا ہے کہ آدمی نے جس دین پر ایمان و یقین کا دعویٰ کیا ہے اسے قائم کرنے کی کوشش کرے اور باطل طاقتیں اس راہ میں مزاحم ہوں تو ان کا زور توڑنے میں اپنے جسم و جان، مال و دولت بلکہ ساری قوتیں اور صلاحیتیں صرف کر دے اور بطور خاص حضرت ابراہیمؑ کے داعیانہ عزم و حوصلہ کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھے کہ انھوں نے پوری زندگی دعوتِ دین میں صرف کر دی لیکن ایک مردِ خدا (لوطؑ) کے سوا پوری قوم نے انکار کر دیا مگر اس کے باوجود وہ مایوس نہیں ہوئے بلکہ جہد مسلسل آخری دم تک جاری رکھا۔

سیرت و سوانح پر کتابیں

۱۔ سیرت النبی	ابن ہشام مکمل ۲ جلدیں	۱۹۰/-
۲۔ سیرت النبی	شبلیؒ و سلیمان ندویؒ ۶ جلدیں	۵۵۰/-
۳۔ رحمۃ للعالمین	سلیمان منصور پوریؒ	۱۱۰/-
۴۔ سیرت سرور عالم	مولانا مودودیؒ ۲ جلدیں	۱۷۰/-
۵۔ الخصائص الکبریٰ	مکمل ۲ جلدیں	۱۷۵/-
۶۔ الرحیق المختوم	صفی الرحمٰن	۱۰۰/-
۷۔ امام ابوحنیفہ	محمد ابوزہرہ	۶۵/-
۸۔ حضرت ابوبکر صدیق	عبدالصبور طارق	۳۰/-
۹۔ حیات ابوبکر	علی طنطاوی	۴۰/-
۱۰۔ تذکار صحابیات	طالب ہاشمی	۷۰/-
۱۱۔ خیر البشر کے بہ جاں نثار	"	۳۲/-
۱۲۔ آسمان ہدایت کے ستر ستارے	"	۷۰/-

ملنے کا پتا: **مکتبہ تحقیق** پان والی کوٹھی۔ دودھ پور۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱